میں نے مضمون نویسی کیسے سیکھی؟

مائل خیرآبادی

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے مضمون نویسی کیسے سیکھی؟

(۱)

ٹھیک جواب تو یہ ہے کہ جیسے میرے اللہ نے سکھایا ویسے میں نے مضمون لکھنا سیکھا لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو خود آکر نہ کچھ سکھاتا ہے، نہ پڑھاتا لکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ایسا ذریعہ پیدا فرما دیتا ہے کہ بندے کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ بس یہی میرے ساتھ ہوا۔ یہ اللہ کا فضل ہی تو تھا کہ اس نے ہمارے چچا میاں کو ہم پر مہربان کر دیا۔ ہمارے چچا میاں نے اس طرح ہمیں مضمون نویسی سکھائی کہ اس سے اچھی طرح کوئی سکھا نہیں سکتا۔ آیئے آج آپ کو بتائیں کہ ہمارے چچا میاں نے ہمیں مضمون لکھنا کیسے سکھایا؟

جب ہم کچھ کچھ لکھنے لگے تو پہلے چچا میاں کچھ دن ہمیں املا بولتے رہے پھر کبھی کبھی کہتے کوئی آپ بیتی لکھو ہم نے آپ بیتی کا مطلب پوچھا تو بتایا۔ جو کچھ تم پر بیتی ہو، وہی لکھ دو۔ ہم سب نے کہا ”اچھا“ پھر میں نے آپ بیتی لکھی۔

آپ بیتی

"ایک دن میرے ابا کے لیے لائے۔ امی جان نے مجھے ایک کیلا دیا اور کہا کہ چھلکا ادھر اُدھر مت پھینکنا لیکن میں نے امی جان کی بات سنی ان سنی کر دی۔ کیلا چھیلا۔ چھلکا صحن میں ڈال دیا، کیلا کھالیا اور کھیلنے لگا۔ کھیلتے کھیلتے کیلے کے چھلکے پر میرا پاؤں پڑ گیا۔ میں دھڑام سے زمین پر گرا۔ بڑی چوٹ آئی۔ میں رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر امی جان میرے پاس آئیں۔ مجھے اُٹھایا۔ پوچھا کیسے گرے؟ میں نے سارا حال بتایا۔ انھوں نے کہا کہ جو بچّہ اپنی ماں کا کہنا نہیں مانتا، وہ ایسی ہی چوٹ کھاتا ہے۔"

میں نے دل میں کہا کہ امی جان کی بات بالکل سچی ہے

(۲)

چچا میاں کچھ دنوں آپ بیتیاں لکھاتے رہے۔ آپ بیتیاں لکھا لکھا کر مضمون نویسی سکھاتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے لکھنا بتاتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن کہنے لگے "اب آنکھوں دیکھا حال لکھو بھئی"۔

"چچا میاں! "آنکھوں دیکھا حال" کسے کہتے ہیں" میں نے پوچھا۔ بتایا کہ "جہاں کہیں کچھ ہوتے دیکھو، وہی کہہ دو جیسے ادھر دیکھو، وہ دیکھو ایک لڑکا آ رہا ہے۔ وہ دیکھو، اس نے ایک ڈھیلا اٹھایا، ڈھیلا اٹھا کر اس نے ایک دیوار پر مارا۔ ارے ارے، دیکھو تو جس جگہ ڈھیلا لگا، وہاں سے بھڑیں اڑنے لگیں۔ وہ دیکھو بھڑیں لڑکے کے چمٹ گئیں۔ لڑکا بھاگ

رہا ہے رو رہا ہے، شور کر رہا ہے۔ اے لو، وہ ایک گڑھے میں گر پڑا۔ آؤ اس کی مدد کریں۔

اس کے بعد چچا میاں ہمیں ساتھ لے کر ادھر چلے۔ بھڑیں اب اڑ چکی تھیں۔ ہم نے جا کر لڑکے کو گڑھے سے نکالا۔ اسپتال لے گئے، اسے دوا پلوائی اور دلوائی پھر اس کا پتہ پوچھ کر اس کے گھر بھیج آئے۔

گھر آ کر چچا میاں نے یہی آنکھوں دیکھا حال لکھوایا پھر بولے، اب جو تم نے کبھی کوئی بات دیکھی ہو وہی لکھ دو۔ میں نے پہلے پہل یہ آنکھوں دیکھا حال لکھا:۔

ایک لڑکے نے ایک پلا پکڑ لیا۔ وہ اُسے لیے جا رہا تھا۔ اچانک ایک کتیا آئی اور وہ لڑکے پر جھپٹ پڑی۔ اس نے لڑکے کو زخمی کر دیا تو پلا لڑکے کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا لڑکا روتا ہوا بھاگ گیا۔

آنکھوں دیکھا یہ حال میں نے لکھنے کو تو لکھ لیا مگر مجھے پسند نہ آیا۔ دوسرا واقعہ یوں لکھا:۔

آنکھوں دیکھا حال

میں اپنے گھر کے باہری کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ میرے مکان کے سامنے جلال کا مکان ہے۔ جلال گھر سے نکلا۔ اپنے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک سیب تھا اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی۔ تھوڑی دیر میں ایک چھوٹا سا لڑکا ادھر سے گزرا۔ جلال نے اس چھوٹے بچے کو پاس بلایا۔ اس سے کہا، لو یہ سیب لو۔ بچے نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اب جلال نے بیچارے بچے کے ہاتھ پر زور سے چھڑی ماری بچہ تلملا گیا اور روتا ہوا بھاگا۔ جلال اپنی اس حرکت پر خوب ہنسا۔ اس کے بعد اس نے یہ حرکت کئی لڑکوں کے ساتھ کی۔

میں دیکھ رہا تھا، مجھے بڑا بُرا لگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا، اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں بھی چھڑی تھی۔ اس نے جلال سے کہا، "لو، یہ روپیہ لیتے ہو؟" جلال نے روپیے کے لالچ میں ہاتھ پھیلا دیا۔ اس آدمی نے زور سے چھڑی جلال کے ہاتھ پر ماری۔ جلال چوٹ کھا کر تلملا گیا۔ وہ آدمی یہ کہتا ہوا آگے چلا گیا "بیٹا! ایسی ہی چوٹ دوسروں کی سمجھا کرو۔"

میں نے کھڑکی سے یہ سب دیکھا۔ دل میں کہا "اللہ نے کتنی جلد جلال کو سزا دلوائی۔"

یہ آنکھوں دیکھا حال، لکھ کر چچا میاں کو دکھایا، انھوں نے اصلاح کے بعد کہا۔ "تمہارے اس مضمون میں ایک بات بڑھ جائے تو مضمون میں چار چاند لگ جائیں۔"

میں نے پوچھا "کیا؟" فرمایا:۔
اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ نصیحت جس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے لیے پسند نہ کرو وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو۔
چچا میاں سے یہ سن کر میں پھڑک اٹھا اور میں نے یہی جملہ مضمون کے آخر میں لکھدیا۔
اس کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آپ سے آپ آگئی کہ مضمون نویسی کے لیے بہت سی باتیں جاننا ضروری ہیں۔ پھر مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔

(۳)

ایک دن چچا میاں نے مجھ سے کہا "جاؤ بیٹا! نسیمہ کی ماں کے گھر نسیمہ کے ابا کا خط آیا ہے۔ خط پڑھ کر سنا آؤ۔"
چچا میاں سے یہ سنا تو میں نسیمہ کے گھر گیا۔ نسیمہ کی ماں نے مجھے بلایا۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے دعا دی۔ پھر ایک پوسٹ کارڈ دیا۔ اور کہا "بیٹا! یہ پڑھ کر سنادو۔"
میں نے ایک نظر خط کی عبارت پر ڈالی۔ پھر اس طرح پڑھنے لگا:۔

بارود خانہ، لکھنؤ
۵ر نومبر ۱۹۶۸ء

پیاری بیٹی نسیمہ! السلام علیکم ورحمتہ اللہ
میں لکھنؤ آرام سے پہنچ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور تم سب کی حفاظت کے لیے اللہ سے دعا کی۔ اب میں دسمبر میں گھر آؤں گا۔ اپنی امی جان سے کہنا کہ پڑوس کے شوکت بھائی کے ذریعہ راشن ڈپو سے شکر منگوالیا کریں۔ کوئی غیر شخص آکر کہے کہ لاؤ شکر لادوں تو اس سے ہرگز نہ منگوائیں یہاں سنا کہ ایک شخص ایک صاحب کے گھر پہنچا۔ اس نے کواڑ کی کنڈی بجائی۔ مکان کے مرد اپنے اپنے کاموں

پر جا چکے تھے۔ گھر والی نے پوچھا "کون صاحب ؟" جواب ملا کہ راشن کی دوکان سے شبرات کے لیے دو کلو شکر مل رہی ہے۔ آج آخری دن ہے۔ منگوانا ہو تو میں جا کر لا دوں۔ گھر والی نے جھٹ روپیہ اور راشن کارڈ اسے دیدیا۔ پھر نہ شکر آئی، نہ وہ آدمی اور نہ راشن کارڈ ہی واپس ہوا۔ یہ دھوکا یہاں ایک آدمی نے کیا۔

اور دیکھو، نسیمہ کا نام میں نے بچیوں کے مدرسہ میں لکھا دیا ہے۔ اس کی غیر حاضری نہ ہونے پائے۔ اسے پڑھنے کے لیے بھیجتی رہنا اور گھر پر اچھی باتیں بتاتے رہنا اور نماز سکھاتی رہنا۔ اب میں خرچ ۱۰ر نومبر کو بھیجوں گا۔

والسّلام دعاگو

شریف احمد

لکھنؤ

خط پڑھ کر میں چلا آیا۔ چچا میاں نے پوچھا "پڑھ لیا تھا پورا خط ؟" میں نے کہا "جی ہاں! اور پھر میں خط کا مضمون بتانے لگا تو چچا میاں نے کہا "بیٹا! جب تم کسی کا خط پڑھنے جاؤ تو پھر خط کا حال کسی غیر کو مت بتاؤ اور نہ اجازت کے بغیر کسی کا خط پڑھو۔ اسلام میں یہ بات منع ہے۔

میں نے کہا "اچھا" اور پھر دوسرے یا تیسرے دن نسیمہ کی امی جان نے مجھے بلایا اور کہا "لو بیٹا! یہ پوسٹ کارڈ ہے اس دن کے خط کا جواب لکھ دو۔" اب تو میں گھبرایا۔ میں نے خط کبھی لکھا نہیں تھا۔ میں نے یہی بات نسیمہ کی ماں سے کہہ دی۔ وہ بیچاری اُداس ہو گئیں۔ ان کو اُداس دیکھ کر میں نے کہا "اچھا ٹھہریے، میں جا کر چچا میاں سے پوچھے آتا ہوں کہ خط کیسے لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کا خط لکھ دوں گا۔ آپ ذرا دیر صبر کریں۔

خط لکھنا

میں دوڑتا ہوا چچا میاں کے پاس آیا۔ پوچھا "خط کیسے لکھا جاتا ہے" چچا میاں نے بتایا کہ سب سے پہلے خط کے داہنی طرف اوپر اس جگہ کا نام لکھا جاتا ہے، جہاں سے خط روانہ کیا جاتا ہے، اس کے نیچے تاریخ لکھتے ہیں۔ اس کے بعد القاب و آداب۔

میں نے پوچھا "یہ القاب و آداب کیا؟" چچا میاں نے بتایا کہ جیسے نسیمہ اپنے ابا کو خط لکھ رہی ہے تو وہ اپنے ابا کو جس طرح پکارتی ہے وہی لکھنا چاہیے۔ اسی طرح کوئی دوست اپنے دوست کو جس طرح پکارے وہی خط میں لکھا جا ے تو یہ سب ہوئے القاب اور آداب کا مطلب یہ ہے کہ القاب لکھ کر لکھیں "السلام علیکم"۔

سلام کے بعد جو کچھ لکھنا ہو، وہ سب لکھا جائے۔ آخر میں "والسلام" لکھ کر خط بھیجنے والے کا نام لکھنا چاہیے۔

میں یہ سمجھ کر اُٹھا تو چچا میاں نے ایک بات اور بتائی۔ ایک پرانا پوسٹ کارڈ دکھا کر کہا کہ دیکھو، پوسٹ کارڈ کے اس طرف ٹکٹ چھپا ہے۔ اس ٹکٹ کے نیچے پوسٹ کارڈ کے آدھے حصے میں کئی لکیریں نقطہ دار ہیں۔ ان پر اس شخص کا پتہ لکھا جاتا ہے جس کے پاس خط لکھیں۔ پہلے نام پھر نمبر مکان اور محلہ اور پھر ڈاک خانہ و شہر۔

چچا میاں نے اس طرح سمجھایا تو میں نے جا کر نسیمہ کے ابا کو اس طرح خط لکھا:۔

مغل پورہ مراد آباد

۸ / نومبر ۱۹۶۸ء

ابّا جان! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ راشن سے شکر لانے کے بارے میں آپ نے بڑی اچھی نصیحت کی۔ آپ یہاں سے بے فکر رہیے۔ اللہ ہمارا حافظ اور نگراں ہے۔ اماں جان مجھے روز پڑھنے بھیجتی ہیں۔ میں بڑے شوق سے پڑھنے جاتی ہوں۔ بچیوں کے مدرسہ میں مجھے سب سے پہلے یہ بات سکھائی گئی ہے۔ بار بار رٹا کر یاد کرادی گئی ہے۔ آپ بھی سنیے۔

دین اسلام کی پہلی بات
سب باتوں میں اچھی بات
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ !
محمّد رسول اللّٰہ!

امی جان یہ سُن کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ اماں جان نے مجھے بتایا کہ یہی تو کلمہ طیبہ ہے۔ کلمہ طیبہ پڑھ کر ہی تو انسان مسلمان ہوتا ہے۔

ابّا جان! یہاں ایک حادثہ ہوگیا۔ جلال شبرات کے دن آتش بازی چھوڑ رہا تھا۔ چھچھوندر داغی تو وہ اس کے پاجامے میں گھس گئی اور جلال کا پیر بُری طرح جل گیا۔ میں نے سُنا تو امی جان سے کہا کہ توبہ ہے، میں آتش بازی سے دور رہوں گی۔ امی جان نے شبرات کے دن روزہ رکھا تھا مجھے آپ یاد آرہے تھے۔ میں بھی تو آپ میرے بڑے اچھے ابا۔ والسّلام۔

آپ کی پیاری بیٹی نسیمہ۔

یہ مضمون لکھ کر میں نے اس طرح پتہ لکھا:۔

جناب شریف احمد صاحب سپروائزر

محلہ بارود خانہ ۱۷ مکان نمبر ۱۴ لکھنؤ۔

خط لکھ کر میں چچا میاں کے پاس گیا اور اُن سے کہا "خط لکھ آیا"۔ اب چچا میاں نے کہا "اچھا لو، یہ ہے پوسٹ کارڈ، ایک خط اپنے بھائی جان کو علی گڑھ لکھو۔

میں نے پوسٹ کارڈ لے لیا۔ پوچھا کیا لکھوں؟ کہا "جو جی چاہے لکھو"۔
یہ سُن کر میں بہت خوش ہو گیا۔ میں نے بھائی جان کو خط لکھا۔ خط میں وہ سب کچھ لکھا، جو میں بھائی جان سے کہہ سکتا تھا۔ بھائی جان کو خط لکھتے وقت مجھے ایسا لگا جیسے بھائی جان سے میں باتیں کر رہا ہوں۔ خط لکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ پھر تو میں ہر ہفتہ بھائی جان کو خط لکھنے لگا اور اس طرح مجھے خط لکھنا آگیا۔

---

(۴)

قصّے لکھنا

جب میں خط لکھنے لگا تو چچا میاں نے ایک قصّہ سنایا۔ بڑا اچھا قصّہ۔ میں نے بڑے غور سے سُنا۔ مجھے مزا آیا۔ قصّہ سُنا کر چچا میاں نے پوچھا "کیسا قصّہ ہے؟"
میں نے کہا "بہت اچھا۔"

"تمہیں یاد بھی ہو گیا ہو گا؟" چچا میاں نے پھر پوچھا۔ میں نے کہا "جی ہاں، بالکل یاد ہو گیا۔"

"اچھا تو سناؤ؟" چچا میاں نے کہا اور میں نے قصّہ دہرا دیا۔ میں نے قصّہ دہرا دیا۔ تو کہنے لگے:-

"اچھا اسے لکھ لاؤ۔"

چچا میاں کے کہنے سے میں نے قلم کاغذ اُٹھایا اور اس طرح لکھنا شروع کر دیا:-

ایک بادشاہ تھا۔ بادشاہ کا نام تھا شاہجہاں۔ شاہجہاں بڑا اچھا بادشاہ تھا۔ وہ روزہ نماز کا پابند بھی تھا اور رعایا کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح کرتا تھا۔ اس کے راج میں سب لوگ بہت خوش خوش زندگی بسر کرتے تھے۔ اس بادشاہ کو دو ایسے شوق تھے جن کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کو پورا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کر دیتا تھا۔ ایک شوق تھا عمارتیں بنانے کا اور دوسرا شوق تھا

ہاتھیوں کو آپس میں لڑانے کا" جیسے آج کل مرغے، مینڈھے وغیرہ لڑائے جاتے ہیں، اسی طرح وہ ہاتھیوں کو لڑاتا تھا اور بڑے شوق سے ان کی لڑائی دیکھتا تھا۔ جب ہاتھی لڑائے جاتے تو بادشاہ قلعے کی چھت پر بیٹھتا اور جھروکے سے یہ تماشا دیکھتا تھا۔ باقی لوگ اس میدان میں دور دور کھڑے ہو جاتے جہاں ہاتھی لڑائے جاتے تھے۔ شاہجہاں کے یہاں ایسے ہاتھی پلے ہوئے تھے۔ ان میں دو ہاتھی بڑے زبردست تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ یہی دونوں ہاتھی لڑائے گئے۔ بادشاہ جھروکے میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لوگ میدان میں کھڑے دیکھ رہے تھے دیکھنے والوں میں بادشاہ کے درباری۔ اس کے بیٹے اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ شاہجہاں کا ایک بیٹا اورنگ زیب بھی ایک طرف اپنے گھوڑے پر سوار یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اب سُنیے مزے دار بات۔

ہاتھی دیر تک لڑتے رہے۔ پھر ایک ہاتھی ہار کر بھاگا۔ اب دیکھیے یہ بھگوڑا ہاتھی اس طرف بھاگا جدھر اورنگ زیب اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ ہاتھی ادھر آیا تو لوگ بھاگے جیتنے والے ہاتھی کو تو لوگوں نے روک لیا۔ لیکن یہ ہاتھی نہ رکا۔ ٹھیک شہزادے کے سامنے بھاگم بھاگ آ رہا تھا۔

اس وقت شہزادہ اورنگ زیب کی عمر چودہ سال کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ آس پاس کے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور ہاتھی ہے کہ چلا آ رہا ہے۔ اس نے دیکھا کہ بھاگنا تو ٹھیک نہیں لوگ دیکھیں گے تو ہنسیں گے کہ بادشاہ کا بیٹا اور ڈرپوک۔ یہ سوچ کر وہ ڈٹ گیا اس نے تلوار نکال لی۔ ہاتھی نے سامنے اُسے دیکھا تو حملہ کر دیا۔ سونڈ بڑھا کر چلا کہ شہزادے کو پکڑ لے۔ ادھر شہزادے نے تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ ہاتھی کی سونڈ کٹ کر زمین پر گر پڑی۔

ادھر بادشاہ کے سپاہیوں نے شہزادے اور ہاتھی کی لڑائی دیکھی تو آگ کی مشعلیں لے کر دوڑے۔ ڈھول، جھانجھیں بجاتے ہوئے اور شور کرتے ہوئے آئے تاکہ ہاتھی کو ڈرا کر بھگا دیں مگر ہاتھی کا حال یہ کہ ایک تو وہ ہارا ہوا تھا دوسرے سونڈ کٹا چکا تھا، وہ شہزادے سے بدلہ لینے پر اڑ گیا۔ اس نے بڑھ کر شہزادے کے گھوڑے کو گرا دیا۔ شہزادہ کود کر دور جا کھڑا ہوا اور اب اس نے نیزہ سنبھالا۔ اتنی دیر میں ہاتھی نے گھوڑے کے سینے پر لات رکھ دی اور اسے پیس ڈالا۔ شہزادے نے پینترا بدل کر نیزہ مارا نیزہ ہاتھی کے کان میں لگا اور گھس گیا۔ ہاتھی نے چنگھاڑ ماری بڑے بڑوں کے دل دہل گئے۔ شہزادہ پینترا بدل کر ایک طرف ہٹ گیا اور پھر وار کرنے کے لیے بڑھا۔ اتنی دیر میں مشعلوں والے، ڈھول اور جھانجھیوں والے اور دوسرے لوگ آ گئے۔ شاہجہاں بھی گھبرا کر قلعہ سے اتر آیا۔ سب نے مل جل کر کسی نہ کسی طرح ہاتھی کو بھگایا۔ شہزادہ اب بھی خم ٹھونکے کھڑا تھا۔

بادشاہ نے بہادر بیٹے کو جیتا اور سلامت دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ اس کے برابر سونا تول کر خیرات کیا اور شہزادے کو بھی بہت کچھ انعام دیا۔ اس کے بعد نصیحت کی کہ بیٹا! اس طرح ہمت نہیں کرتے۔ سوچ سمجھ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ تم چودہ برس کے اور یہ جنگی ہاتھی۔ تمہارا اس کا مقابلہ ہی کیا؟"

اس طرح بادشاہ نے سمجھایا تو شہزادے نے کہا کہ میں نے پڑھا ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق سے بڑھ کر بنایا ہے۔ اب اگر میں اس ہاتھی سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوتا تو یہ انسان کی توہین ہوتی۔ میں نے یہ سوچا کہ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اللہ میری مدد کرے گا۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے ہاتھی پر فتح دی اور انسان کو یہ بڑائی دی کہ وہ بڑے سے بڑے جانوروں کو بھی ہرا سکتا ہے۔

یہ قصہ لکھ کر میں نے چچا میاں کو دکھایا۔ چچا میاں نے پڑھا بہت خوش

ہوئے۔ بڑی شاباشی دی۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ ایسے قصوں کو تاریخی کہتے ہیں یعنی وہ قصے جو سچے ہوں اور کسی کتاب میں لکھے ہوں لوگوں سے سنے ہوں۔

اس کے بعد چچا میاں نے سمجھایا کہ اسی طرح کے وہ قصے بھی جو اللہ کے نبیوں کے بارے میں ہیں۔ اللہ کے ولیوں کے بارے میں ہیں۔ ان قصوں کو سیرت کے واقعات کہتے ہیں۔

یہ کہہ کر چچا میاں نے مجھے کئی کتابیں دیں۔ ایک کتاب کا نام تھا "نبیوں کے حالات" اس میں اللہ کے نبیوں کے حالات لکھے تھے۔ دوسری کتاب کا نام تھا "پیارے صحابہؓ" اس کتاب میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے ساتھیوں کے قصے تھے۔ ایک اور کتاب دی۔ اس کا نام تھا "اللہ والے" اس میں بڑے بڑے اماموں بزرگوں اور عالموں کے واقعات تھے۔

یہ کتابیں پڑھ کر میرا علم بہت بڑھا۔ چچا میاں دوسرے تیسرے کہتے کہ اچھا آج حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ لکھ کر دکھاؤ۔ آج امام ابوحنیفہؒ کا حال لکھو اور آج خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بارے میں لکھو۔

میں ان بزرگوں کے حالات لکھ لکھ کر دکھاتا۔ چچا میاں بہت خوش ہوتے۔ میری ہمت بڑھی۔ اب میری یہ حالت ہوگئی کہ کہانی تو پہلے ایک صفحہ دو صفحہ لکھنا مشکل تھا، اب کئی کئی صفحے لکھ ڈالتا۔ اگر غلطیاں کرتا تو کچھ تو چچا میاں ٹھیک کر دیتے باقی غلطیوں کے بارے میں کہتے "خود ٹھیک کرو۔"

"ارے بھئی، میں خود کیسے ٹھیک کروں" سچ کہیے اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ بھی تو یہی سوچتے۔ کوئی خود ہی اپنی اصلاح کرلے تو کاہے کو دوسروں کو استاد بنائے۔ مگر بھئی سچی بات یہ ہے کہ ہمارے چچا میاں مجھے اس طرح مضمون نگاری سکھا رہے تھے کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ مجھے کیا بتا رہے ہیں۔ چچا میاں نے مجھ سے کہا:

"کتاب میں یہی قصہ پھر پڑھ لو اور دیکھو کہ تم نے کہاں کہاں اس سے الگ ہو کر لکھا ہے۔ اسی کے مطابق پھر سے ٹھیک کر لو۔"

اس طرح جو میں نے اپنے لکھے ہوئے مضمون کی اصلاح کی تو میری قابلیت اور بڑھی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اب جو کچھ میں لکھتا پھر دوبارہ اسے پڑھتا تو اپنی غلطی خود ہی ٹھیک کر لیتا۔ یہ اپنی جانچ آپ کرنے سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ آگے چل کر پھر مجھے یہ ضرورت نہیں پڑی کہ کسی سے مدد لوں مگر یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب آپ کو اس وقت ملے گا جب آپ یہ پڑھیں گے کہ میں نے قصے کہانیوں سے ہٹ کر خالص مضمون لکھا اس کا حال سنیئے۔

۱ ——————

کہانی لکھنا

میں بہت دنوں تک تاریخی قصّے لکھتا رہا۔ یہ تاریخی قصّے کسی کتاب میں پڑھتا یا اخبار اور رسالوں میں دیکھتا بس جھٹ اپنے لفظوں میں لکھنے کے لیے قلم اٹھا لیتا اور لکھ ڈالتا۔

ایک دن ایک رسالہ دیکھ رہا تھا اس رسالے میں ہمارے ملک کے ایک بادشاہ کا حال چھپا تھا۔ مگر اس میں ایک بات ایسی تھی جس کے بارے میں مجھے یہ شک پیدا ہوا کہ یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً اس میں تھا کہ بادشاہ بیمار ہو گیا۔ اس کی بیگم کو اس سے بڑی محبت تھی۔ بڑا علاج ہوا لیکن بادشاہ اچھا نہیں ہوا۔ مر گیا۔ جس وقت وہ مرا تو بیگم اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے موت کے دیوتا (جمراج) کو دیکھ لیا بس جھٹ لپکی اور دیوتا کی وہ جھولی چھین لی جس میں اس نے بادشاہ کی روح رکھ لی تھی۔ بیگم نے جھٹ جھولی الٹ دی۔ جھولی الٹ دینے سے بادشاہ کی روح آزاد ہو گئی اور وہ پھر بادشاہ کے جسم میں واپس آ گئی۔ بادشاہ پھر زندہ ہو گیا۔ مزے دار بات یہ ہوئی کہ (جمراج) کی اس جھولی میں اور بہت سی روحیں تھیں۔ وہ سب آزاد ہو گئیں اور اپنے اپنے جسموں میں چلی گئیں اور بادشاہ کے ساتھ ہزاروں مرے ہوئے انسان پھر جی اٹھے۔ پھر جمراج نے جا کر ایشور سے شکایت کی تو ایشور نے کہا کہ کل بادشاہ کی بیگم نے ایک بھوکے کو کھانا کھلایا تھا اور اس نے بادشاہ کی زندگی کے

لیے دعا کی تھی۔ اس کی دُعا قبول ہوگئی لیکن ہم تم کو بتانا بھول گئے۔ تمہارے رجسٹر میں بادشاہ کی موت لکھی تھی۔ تم نے اپنا کام کیا۔ چلو چھوڑو، جانے دو۔

بادشاہ کا یہ حال تھا تو بڑا مزے دار مگر مجھے اس کے سچ ہونے میں شبہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس بادشاہ کا نام تاریخ کی کتابوں میں تلاش کیا مگر نہ ملا۔ پھر میں نے چچا میاں کو یہی قصہ دکھایا۔ چچا میاں نے پڑھا پھر مجھ سے کہا "تم کو اس قصے پر کیا اعتراض ہے؟" میں نے جواب دیا:۔

(۱) اول تو کوئی موت کے فرشتے کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہی بات غلط ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ کوئی فرشتہ یا دیوتا ایسا کمزور نہیں ہوتا کہ وہ ایک عورت سے ہار جائے۔ وہ تو خدا کی طرف سے اس کا حکم بجالانے آتا ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ اگر ایسا ہونے لگے تو پھر کاہے کو کوئی مر سکے لوگ کوئی نیک کام کرکے اللہ کو راضی کرلیں اور پھر فرشتے سے اپنے آدمی کی روح چھین لیں۔

(۴) چوتھی بات تو بالکل مذاق معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ کی روح کے ساتھ اور سی بہت سی روحیں زندہ ہوگئیں۔

(۵) پانچویں بات یہ کہ عورت نے ایک نیکی کی تو اس سے موت کا وقت ٹل گیا اور پھر خدا یہ بھول گیا کہ موت کے فرشتے کے رجسٹر میں بادشاہ کی موت کا جو وقت لکھا تھا اُسے کاٹا نہیں۔

یہ سب بتانے کے بعد میں نے چچا میاں سے کہا "وہ خدا ہی کیا جو بھول جاتا ہو۔ خدا تو بے عیب ہے۔

چچا میاں نے میرا یہ جواب سُنا تو خوشی کے مارے اچھل پڑے میری پیٹھ ٹھونکی، شاباشی دی اور اپنی جیب سے ساڑھے پندرہ روپیہ کا نیا فاؤنٹین پن نکال کر مجھے انعام دیا۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ ایک بات کا

جواب اور دو۔ جس نے یہ قصہ لکھا ہے اس نے پڑھنے والوں کو کس بات پر ابھارا ہے؟

میں نے کچھ دیر سوچا پھر بولا "شاید خدا کی راہ میں خیرات کرنے پر ابھارا ہے۔"

"ٹھیک بالکل ٹھیک" چچا میاں کی زبان سے نکلا اس کے بعد کہنے لگے کہ دیکھو، جیسا تم سمجھتے ہو، یہ کوئی تاریخی قصہ نہیں ہے، لکھنے والے نے یہ ایک کہانی گڑھی ہے۔ یہ کہانی بالکل ویسی ہی ہے جیسی میں بچپن میں اپنی نانی، دادی اور دوسرے لوگوں سے سنا کرتا تھا۔ ایسی ہی کہانیاں لکھنے کا کسی زمانے میں بڑا رواج تھا۔"

"مگر سنیئے تو چچا میاں!" میں نے چچا میاں کی بات کاٹ کر کہا۔ اس جھوٹ اور من گڑھت بات سے فائدہ؟"

چچا میاں نے کہا۔ "وہی بات میں سمجھا رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ لکھنے والا ایک نصیحت کرنا چاہتا تھا کہ خیرات کرنا اچھا کام ہے اس نصیحت کو نہایت دلچسپ طریقے سے بیان کرنا چاہتا تھا۔ تم جانتے ہو کہ کہانی قصے میں بات کیسی مزے دار ہو جاتی ہے تو بس اس نے یہ کہانی بنا ڈالی لیکن اس کے لیے جو کہانی گڑھی اس میں ایسی باتیں بھر دیں جو کسی کی عقل میں نہیں آسکتیں یعنی لوگ انھیں سچ نہیں مانتے جیسے تم نے نہیں مانا۔

اب ایسی کہانیوں کے لکھنے کا رواج نہیں ہے۔ اب کہانیاں اس طرح لکھی جاتی ہیں جو ہمارے روزمرہ کاموں اور ہماری ہر دن کی باتوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ میں نے تم کو ایسی ہی کہانیاں سنائی اور پڑھائی ہیں۔ جھوٹی معلوم ہونے والی کہانیوں سے تم کو بچایا ہے۔

چچا میاں سے یہ سنا تو میرے دل میں کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے کہا "چچا میاں! کہانی لکھنے کا طریقہ بتائیے" چچا میاں نے اس طرح بتانا شروع کیا:۔

دیکھو بھئی، کہانی لکھتے وقت سب سے پہلے یہ سوچنا ہوگا کہ تم کیا بات لوگوں کو بتانا چاہتے ہو۔ فرض کر لو، تم لوگوں کو ہمدردی کے بارے میں ابھارنا چاہتے ہو تو ایسی کہانی بناؤ گے کہ کسی کو غریب بوڑھیا یا اندھے فقیر یا مفلس طالب علم جو فیس ادا نہ کر سکا یا ایسے ہی بیماروں، محتاجوں کی مدد کرتا دکھاؤ گے۔ تم یوں لکھو گے:۔

"ایک لڑکا تھا۔ وہ بڑا نیک تھا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ اندھا جا رہا تھا۔ وہ اندھا ایک گڑھے کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ نیک لڑکے نے دیکھ لیا اور بڑھ کر اسے دوسری طرف موڑ دیا۔ اندھا دعائیں دیتا چلا گیا۔"

یہ کہانی میں نے مثال کے طور پر بیان کی۔ ویسے یہ کہانی جب اچھی طرح لکھی جائے گی تو کئی صفحوں میں لکھی جا سکتی ہے۔ میں نے تو طریقہ بتانے کے لیے مثال دی۔ اچھا اب تم "معافی پر کوئی کہانی سوچ کر لکھو۔"

چچا میاں نے اس طرح سمجھایا تو میں کہانی لکھنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ کہانی لکھی:۔

محمود ایک لڑکا تھا۔ وہ بڑا نیک تھا۔ ایک بار اس کو جلال نے گالی دی لیکن محمود نے اسے معاف کر دیا۔"

یہ دو سطریں لکھ کر میں سوچنے لگا کہ کہانی تو ختم ہوئی میں اپنی اس کہانی پر خود ہی ہنس دیا۔ دل نے کہا۔ یہ تو کہانی نہیں بنی۔ تو بھائی میں نے اسے پھاڑ ڈالا۔ اور پھر سوچنے لگا۔ پھر میں نے اس طرح کہانی شروع کی:۔

ایک تھا محمود، "ایک تھا جلال۔ ایک بار دونوں میں لڑائی ہوگئی جلال نے محمود کو اٹھا کر پٹک دیا۔ محمود کمزور تھا، پٹ کر چلا آیا اور اپنے دروازے پر آ بیٹھا۔ ہاتھ میں بڑا سا اینٹ کا ٹکڑا لیے۔ اس نے سوچا کہ جلال ادھر سے نکلے گا تو اینٹ پھینک مارے گا اور گھر میں بھاگ جائے گا۔ اس طرح بدلہ لے لے گا۔

محمود اسی سوچ میں بیٹھا تھا۔ اتنے میں اس کے ابا آگئے۔ ابا نے پوچھا کیسے بیٹھے ہو محمود؟" محمود نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے ابا نے کہا "بیٹا! محمود معاف کردو۔ اس میں بڑا ثواب ہے۔" یہ سُن کر محمود نے معاف کردیا۔

یہ کہانی لکھ کر دو بار پڑھی تو مزا نہ آیا۔ نہایت پھیکی بے مزا کہانی بنی، میں نے اسے بھی پھاڑ ڈالا اور پھر سوچنے لگا۔ میں نے بہت سوچا، بہت سوچا۔ ارے بھئی میں نے بہت ہی سوچا لیکن جب سوچ کر کہانی لکھی تو بس ایسی ہی پھیکی اور بے مزا کہانی بنی۔ آخر میں نے چچا میاں سے جا کر کہا "میں کہانی نہیں لکھ سکوں گا۔" انھوں نے حال پوچھا تو میں نے بتایا۔ وہ مُسکرائے۔ پھر انہوں نے اسی محمود اور جلال والی کہانی میں ایسی بات بڑھا دی کہ میں پھڑک اٹھا اور کہنے لگا۔ ہاں اب مزے دار بھی ہوگی اور اس کا اثر بھی دوسروں پر اچھا پڑے گا۔ چچا میاں کی بڑھائی ہوئی بات ملا کر اب میں نے اس طرح کہانی لکھی۔

"دو لڑکے تھے، ایک محمود، دوسرا جلال، محمود ذرا کمزور تھا۔ ساتھ ہی سیدھا سادا۔ جلال بڑا تنگڑا تھا مگر بڑا شریر۔ محمود جب اسکول جاتا تو راستے میں جلال کا مکان پڑتا۔ جلال محمود کو چھیڑتا۔ ستاتا اور کبھی کبھی مارتا بھی۔ پریشان ہو کر ایک دن محمود نے اس کے والد سے شکایت کردی تو اس کی خوب پٹائی ہوئی تو جلال محمود کا جانی دشمن ہوگیا۔

ایک دن موقع پا کر جلال نے محمود کو اٹھا کر پٹک دیا اور اتنا مارا، اتنا مارا

کہ محمود وہاں سے اسپتال لے جایا گیا۔ اور ایک مہینہ تک اسپتال میں رہا۔ تب اچھا ہوا۔ اچھا ہو کر وہ بھی جلال کا جانی دشمن ہو گیا۔ مگر تھا اس سے کمزور۔ اس لیے بدلہ لینے کی آسان تدبیر سوچنے لگا۔

ایک دن کی بات ہے۔ محمود کے گھر کی بکری چرواہا نہیں لے گیا۔ محمود کی امی نے کہا "بیٹا بکری لے کر میلے کے میدان میں چلے جاؤ بھوندو اپنے ریوڑ وہیں چگاتا ہے۔ اسی ریوڑ میں بکری چھوڑ آؤ۔"

امی کے کہنے سے محمود نے بکری کو ساتھ لیا۔ میلے کے میدان کی طرف گیا۔ بکری ریوڑ میں چھوڑی۔ واپس ہوا تو پلیا کے اندر اسے کوئی لڑکا بیہوش پڑا دکھائی دیا۔ محمود اس کے پاس گیا۔ بیہوش لڑکے کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ بے ہوش لڑکا جلال تھا۔ جلال کا ایک پاؤں کسی وجہ سے سوج کر کُپا ہو گیا تھا جیسے کسی نے بھرپور چوٹ ماری ہو۔ اور جلال اس چوٹ کو سہہ نہ سکا ہو۔

جلال کو بے ہوش دیکھا تو محمود نے سوچا۔ اس سے اچھا موقع اب کب ملے گا کہ اس سے بدلہ لیا جا سکے گا۔ کیوں نہ پتھر سے سر کچل دوں۔

یہ خیال آنا تھا کہ محمود نے ایک بڑا سا پتھر اُٹھایا لیکن جیسے ہی چاہا کہ جلال کے سر پر دھمک دے، ویسے ہی اُسے اپنی کتاب کا یہ شعر یاد آگیا:۔

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا

یہ شعر یاد آتے ہی محمود کا ہاتھ رُک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے پتھر ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ جلال کی طرف بڑھا۔ اسے اٹھا کر پیٹھ پر لادا۔ پلیا سے باہر لایا۔ ایک رکشا پر جلال کو لے کر بیٹھا۔ اسپتال گیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے جلال کو دیکھا۔ ایک انجکشن لگانے کو کہا۔ انجکشن کی قیمت ۳ روپے چار آنے تھی۔ محمود نے یہ رقم ڈاکٹر

کو دی۔ جلال کے انجکشن لگایا گیا۔ پھر دوسری دوائیں اسپتال سے دی گئیں جلال کو ہوش آیا۔ جلال نے محمود کو دیکھا کہ وہ اس کی تیمار داری میں لگا ہے۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد جلال کے ابّا اسپتال میں آگئے۔ ان کے آنے پر محمود گھر چلا آیا۔ راستے میں اسے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ جلال کو معاف کر کے اور اس کی خدمت کر کے اس نے اتنا بڑا کام کیا ہے کہ وہ رستم سے بھی نہ ہوگا۔

پھر جب جلال اچھا ہو گیا تو ایک دن وہ محمود کے گھر گیا محمود کو دیکھ کر گلے سے لگا لیا اور پھر محمود کا جگری دوست ہو گیا۔ اور اس نے دوسرے لڑکوں سے شرارت کرنا بھی چھوڑ دیا۔"

اس طرح لکھ کر میں نے چچا میاں کو کہانی دکھائی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور بولے "بس اسی طرح کہانیاں لکھا کرو۔"

میں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اپنے دل سے کہانیاں سوچنے میں بڑی محنت پڑتی ہے پھر اللہ کہانی سمجھا دیتا ہے۔ اصل میں اللہ تو سب کو سمجھانے والا ہے۔

---

(۶)

افسانہ لکھنا

جب میں دس بارہ کہانیاں لکھ چکا۔ تو ایک دن چچا میاں نے مجھے ایک کتاب دی۔ کتاب کا نام تھا "اچھے اور سچے افسانے" کتاب کا نام مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے چچا میاں سے پوچھا "افسانہ" کسے کہتے ہیں؟ چچا میاں نے کہا۔ "پہلے تم اس کتاب کے سارے افسانے پڑھ لو، پھر بتائیں گے۔"

میں نے کتاب لے لی۔ یوں ہی ایک جگہ کھول کر دیکھا۔ میرے سامنے ایک عنوان آ گیا۔ عنوان تھا "ابوجہل کا سایہ" عجیب سا عنوان لگا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے پورا افسانہ پڑھ گیا۔ پڑھنے کے بعد سوچنے لگا کہ یہ تو وہ تاریخی واقعہ ہے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تھا اور حضرت عکرمہؓ بھاگ گئے تھے اور پھر ان کی بیوی انھیں واپس لائی تھیں۔ اس کے بعد حضرت عکرمہؓ مسلمان ہو گئے تھے۔

یہ افسانہ اس طرح شروع کیا گیا تھا۔

"اس نے شہریوں کو غیرت دلائی کہ مار نہیں سکتے، مر تو سکتے ہو! آؤ غلامی کا طوق گردن میں ڈالنے سے پہلے گردن ہی کیوں نہ کٹوا دیں۔" اور پھر انھیں ساتھ لے کر شہر کے اس دروازے کی طرف بڑھا، جس سے فاتح کا سپہ سالار اپنے رسالے کے ساتھ شہر میں داخل ہو چکا تھا۔"

حضرت عکرمہؓ کا یہ پورا واقعہ پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ اسے تو درمیان سے شروع کیا گیا ہے لیکن اس میں آگے پیچھے ساری باتیں آ گئی ہیں جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں داخلہ۔ ابوسفیان کا قید ہونا۔ حضرت عکرمہؓ کا بھاگنا۔ کشتی پر سوار

ہونا۔ طوفان کا آنا۔ خدا کو یاد کرنا، مکے والوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانیاں، عام معافی کا اعلان۔ حضور کا فرمانا کہ میں نے جنت میں ابوجہل کا سایہ دیکھا ہے وغیرہ۔ پورا واقعہ اشاروں میں بیان ہوا ہے لیکن ہر پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے۔

یہ واقعہ اس طرح پڑھ کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ایک طرف حضرت عکرمہؓ کی بڑائی میرے دل میں بیٹھی دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر میرا عقیدہ مضبوط ہوا۔ میرا خیال ہے کہ لکھنے والے نے انہی دو باتوں پر اپنے قلم کا سارا زور خرچ کیا ہے۔"

"اچھے اور سچے افسانے" میں جتنے افسانے پڑھے، ان میں کہیں تو بات کسی واقعہ کے آخری حصے سے شروع کی گئی تھی، کہیں بیچ سے اور کہیں دو آدمیوں کی بات چیت سے۔

یہ سب پڑھ تو لیا لیکن مجھے تو سارے افسانے ایک کہانی یا ایک واقعہ ہی لگے۔ پھر جب چچا میاں کے پاس گیا تو ان کے "کیا سمجھے؟" پوچھنے پر وہی سب کہہ دیا جو اوپر بیان ہوا۔ چچا میاں مسکرائے پھر بتایا کہ:۔

دراصل افسانہ کہانی کسی واقعہ کسی حادثہ کے تاثر کو واضح کرنے کا نام ہے۔ یعنی جو کچھ دیکھا یا سنا جائے اس سے جو اثر دل پر پڑے اُسے اس طرح لکھ دیا جائے کہ پڑھنے والا بھی وہی اثر لے۔ اب چاہے واقعہ کہیں سے شروع کر دیا جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ تم نے اب تک جو "میں نے دیکھا"، کے عنوان سے لکھا "آپ بیتی"، کے عنوان سے لکھا، کہانی یا اور کچھ لکھا، افسانہ ان سب سے آگے کی چیز ہے۔ افسانہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ بالکل ایسا ہی مشکل جیسے اچھا شعر کہنا۔ جس طرح ایک شعر نہایت ہی اشاروں میں اور دلچسپ اندازِ بیان کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح افسانہ لکھا جاتا ہے۔ یاد رکھو افسانہ لکھنے والا اپنے سارے افسانے کو اس اثر کے گرد

گھماتا ہے جو اس کے اپنے دل پر ہوتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ افسانے کی کوئی عبارت یا کوئی پیرا خواہ مخواہ ٹھونسا نہ جائے اور افسانہ مختصر تر ہو۔ اچھا بس اب تم ایک افسانہ لکھو۔

میں نے کئی دن سوچ کر یہ افسانہ لکھا:۔

"اور وہ اس کے قدموں سے لپٹ گیا" مجھے بچاؤ" وہ دیکھئے، وہ بدمعاش! لڑکا سیٹھ کے قدموں سے لپٹا تھا۔ سیٹھ رحم دل آدمی تھا۔ اس نے لڑکے کو اٹھایا۔ اتنے میں وہ بدمعاش قریب آ گیا۔ اس نے کہا۔

"اچھا چل تو گھر! نالائق تیرا قیمہ بناؤں گا" یہ کہہ کر بدمعاش لڑکے کو گھسیٹ کر لے چلا۔ اس نے بتایا کہ یہ لڑکا اس کا بھائی ہے۔ سیٹھ اور دوسرے لوگوں نے چپکے اُسے جانے دیا۔

دو بھائیوں کے جانے کے بعد سیٹھ نے اپنی جیب دیکھی۔ جیب کٹ چکی تھی۔ سیٹھ حیران کھڑا تھا اور دونوں لڑکوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

یہ افسانہ لکھ کر میں نے چچا میاں کو دیکھا لیکن انہوں نے اسے ناپسند کر دیا۔ ناپسند ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ اس میں تم نے پڑھنے والوں کو جیب تراشی کا ایک ڈھب سکھا دیا۔ افسانہ بہتر وہ ہوتا ہے جس کے پڑھنے سے نیکی کی رغبت ہو اور برائی سے نفرت۔

اب میں نے دوسرا افسانہ سوچنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے یہ افسانہ لکھا۔

"جاؤ کل آنا۔ اس وقت مجھے فرصت نہیں۔" بدلو نے لاکھ خوشامد کی لیکن مکھیا کسی طرح تھانے جانے پر راضی نہ ہوا۔ بدلو کا خیال یہ تھا کہ اگر مکھیا تھانیدار سے سفارش کر دے تو اس کا بے قصور بیٹا حوالات سے چھوٹ کر گھر آ سکتا ہے۔

مکھیا کے انکار پر بدلو اُداس ہو کر گھر چلا آیا۔ وہ گھر میں کھُری کھٹیا پر لیٹا ہوا بیٹے کو چھڑانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ اتنے میں اس نے شور سنا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کنوئیں میں گر پڑا اور کنواں بھی وہ جس میں "جن بابا" رہتے ہیں۔

بدلو کنوئیں میں گھُسنے کا بہترین ماہر تھا۔ اس نے آنگن میں پڑی ہوئی رسی لی اور کنوئیں کی طرف چل دیا۔ وہاں کنوئیں کے آس پاس بڑا مجمع تھا۔ اس نے پوچھا "کون گرا"۔ بتایا گیا "مکھیا کا بچہ"۔ اس نے دیکھا مکھیا اور اس کی بیوی دونوں ہائے ہائے کرتے دوڑے چلے آرہے تھے۔ اچانک بدلو کے قدم پیچھے ہٹے۔ اسے اپنا بیٹا یاد آگیا لیکن پھر وہ پلٹا۔ "جیسا اپنا غم ویسا دوسرے کا" اس کے دل نے کہا۔ وہ جھٹ کنویں پر پہنچا۔ رسی اس نے کنویں پر رکھے ہوئے لٹھے سے باندھی اور کنویں میں اتر گیا اور دیکھتے دیکھتے بچے کو لے کر کنویں کے اوپر آگیا۔

اب لوگ پاس آگئے۔ جن بابا کا ڈر ختم ہو چکا تھا۔ بدلو نے بچے کو مکھیا کی گود میں دیا اور کچھ کہے بغیر گھر کو چل دیا۔ مکھیا نے بڑھ کر سو روپیہ کا نوٹ اسے دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا۔

"مکھیا جی میں مزدوری نہیں لیتا"

میرا لکھا ہوا یہ افسانہ پڑھ کر چچا میاں بہت خوش ہوئے۔ مجھے شاباشی دی اور لیجیے میں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے۔

---

(۷)

مضمون لکھنا

ایک دن چچا میاں نے کہا "رشاد میاں، تم کو آنکھوں دیکھا حال" لکھنا آگیا، "آپ بیتی" لکھنا آگئی، خط لکھنا آگیا۔ کہانی اور افسانہ لکھنا آگیا۔ اب اگر مضمون لکھنا سیکھ لو تو پورے ادیب ہو جاؤ۔"

"ادیب" میری زبان سے نکلا اور میں بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا "چچا میاں! مضمون تو میں نے بہت لکھے ہیں۔ اسکول میں مضمون لکھنا سکھایا جاتا ہے۔"

"اچھا تو بتاؤ، تم مضمون کس طرح لکھتے ہیں؟" چچا میاں نے پوچھا اور میں نے بتایا کہ ماسٹر صاحب فرما دیتے ہیں کہ ریل پر مضمون لکھو، سچ پر مضمون لکھو، اسی طرح بہت سی باتوں پر مضمون لکھنے کا حکم دے دیتے ہیں۔ بتا بھی دیتے ہیں کہ یہ اور یہ مضمون میں لکھنا۔ بس ہم قلم اٹھا کر دو تین صفحے گھسیٹ دیتے ہیں۔"

چچا میاں مسکرائے "اوں، ہوں، یوں نہیں بھائی! مضمون بڑی تیاری کے بعد لکھا جاتا ہے۔ سنو، میں بتاتا ہوں۔ دیکھو، جس عنوان پر مضمون لکھنا ہوتا ہے، پہلے اس عنوان پر کتابیں پڑھتے ہیں۔ مضمون لکھنے والا جتنی زیادہ کتابیں پڑھے ہوتے ہوتا ہے اس کا مضمون اتنا ہی زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ عنوان سے متعلق وہ ساری باتیں اپنے مضمون میں ترتیب سے لکھتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو اس عنوان کے بارے میں ساری باتیں معلوم ہو جائیں۔ ادھر ادھر کی دو چار باتیں لکھ دینے سے مضمون در اصل مضمون نہیں ہوتا۔ اچھا تو لو، میں ایک عنوان بتاتا ہوں اس پر مضمون لکھو۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا چچا میاں نے عنوان دیا، ہمدردی" اور میں نے قلم لے کر لکھنا شروع کیا۔

اگر ہم دیکھیں کہ کوئی لڑکا گر پڑا تو ہمارا کام یہ ہے کہ ہم بڑھ کر اس کو اٹھائیں اس کے چوٹ لگ گئی ہو تو اسپتال لے جائیں۔ ہمدردی کرنے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔۔۔۔"

ابھی میں نے اتنا ہی لکھا تھا کہ چچا میاں نے کہا "دیکھوں تو کس طرح شروع کیا ختم نے؟" میں نے کاپی بڑھا دی۔ چچا میاں نے دیکھتے ہی کہا:۔

"اوں ہوں یوں نہیں۔ تم کو چاہیئے تھا کہ پہلے ہمدردی کے عنوان سے جو کچھ کتابوں میں پڑھا ہے۔ وہ سب پڑھ لیتے ضروری باتوں کو نوٹ کر لیتے۔ پھر جب لکھنا شروع کرتے تو پہلے ہمدردی کے معنٰی بتاتے۔ پھر یہ بتاتے کہ ہمدردی کرنا اللہ کا حکم ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کا حوالہ دیتے۔ اس طرح بتاتے کہ ہمدردی کرنا ہر انسان پر واجب ہے۔ پھر یہ بتاتے کہ ہمدردی کرنے سے۔ اللہ خوش ہوتا ہے اور ہمدردی کرنے والا جنت کا حقدار بنتا ہے۔ یہ سب بتا کر دو ایک واقعات نقل کرنا چاہیے اس سے مضمون دلچسپ ہو جاتا ہے۔ پھر مضمون کو ختم کرتے کرتے اس میں ایسا اثر پیدا کر دینا چاہیے کہ پڑھنے والا سمجھے کہ ہمدردی ہی در اصل انسانیت ہے اور ہمدردی نہ کرنا جانوروں کا کام ہے۔ اگر کوئی شعر یاد ہو تو وہ بھی کسی جگہ فٹ کرنا چاہیے۔ اس طرح چچا میاں نے بتایا تو مجھے ایسا لگا جیسے مضمون لکھنا کسی بہت بڑے عالم فاضل کا کام ہے میں نے کہا، "چچا میاں! اس طرح تو ایک مضمون کئی دن میں تیار ہوگا۔"

"اور کیا یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے۔ جاؤ پہلے تیاری کرو پھر لکھنا۔"

میں اٹھ کر چلا گیا۔ دو ایک کتابیں چچا میاں نے بتا دیں ان کو پڑھا۔ کچھ

باتیں میری درسی کتابوں میں ملیں۔ میں نے سب نوٹ کرلیں تین دن میں نے تیاری کے بعد اس طرح مضمون لکھا۔

"ہمدردی کے معنی ہیں دوسرے کے غم کو اپنا غم سمجھنا اور مصیبت میں دوسروں کے کام آنا۔ دراصل انسان وہی ہے۔ جو دوسروں سے محبت کرے چچا غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:۔ ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کیلیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اس کا مطلب یہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہمدردی کرنے کے واسطے ہی پیدا کیا ہے۔ ورنہ اس کی عبادت کے لیے فرشتے تھے ہی اور بے شمار تھے اور وہ عبادت کرہی رہے تھے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہمدردی کرنا انسان پر اللہ کی طرف سے فرض کردیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت کو ہمدردی پر طرح طرح سے ابھارا ہے۔ ایک بار فرمایا کہ " ایک مسافر تھا۔ راستے میں اسے پیاس لگی۔ اُسے ایک کنُواں نظر آیا۔ اس نے کنویں سے پانی حاصل کیا۔ پیا اور اپنی چھاگل بھرلی۔ پھر تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اسے ایک پیاسا کُتّا نظر آیا۔ وہ بے چارہ پیاس کے مارے کیچڑ چاٹ رہا تھا مسافر کو اس پر ترس آگیا۔ اسے پانی پلا دیا۔ اس کے اس کام سے اللہ بہت خوش ہوا اور اس پر جنت واجب کردی۔"

ایک اور حدیث میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک جگہ کے کچھ لوگ آئے۔ وہ سب بہت پریشان حال تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا حال دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ تمام صحابہؓ کو بلایا پھر ایک تقریر فرمائی تقریر میں بڑا اثر تھا۔ صحابہؓ تقریر سُن کر رو پڑے اور ان بے چاروں کو اتنا سامان دیا کہ وہ خوش خوش واپس ہوئے۔ ان کو دیکھ کر حضورؐ بھی خوش ہو گئے۔ پھر صحابہؓ کو جنت کی خوش خبری سنائی۔

ہمدردی کرنے سے یہی نہیں کہ ہماری آخرت بنتی ہے۔ یہ دنیا بھی ہمدردی کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے ہمدردی نہ کریں تو ہمارا کام پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا، دنیا کے بدلے جنگل ہو جاتی جس میں ایک جانور دوسرے جانور کو کھا جاتا ہے۔

دنیا میں حاتم طائی کا نام سب نے سنا ہے کہتے ہیں کہ وہ بڑا سخی آدمی تھا۔ سچ پوچھئے تو اس کی سخاوت اسی وجہ سے تھی کہ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ تھا۔ حاتم طائی کی تعریف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ حالانکہ وہ مسلمان نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفت جہاں بھی ہو تعریف کے لائق ہے۔

ذرا سوچئے تو اگر بچے سے ماں کو ہمدردی نہ ہو، اگر باپ بیٹے کا ہمدرد نہ ہو۔ اگر بھائی میں بھائی کا غم نہ ہو تو یہ چھوٹا سا بچہ کس طرح پانچ چھ فیٹ کا انسان بن سکتا ہے۔ اسی طرح والدین کے بڑھاپے میں اولاد ان کی ہمدرد نہ ہو تو ان کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے۔ بدنصیب ہے وہ جو دوسروں کا ہمدرد نہ ہو۔ دراصل ایسا شخص اس کا حقدار ہے کہ اس پر عذاب الٰہی نازل ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ عذابِ الٰہی ایسی قوم پر نازل ہوتا ہے جو اس بہترین صفت سے محروم ہو جاتی ہے۔ قوم فرعون کو اللہ نے اسی لیے غرق کر دیا کیوں کہ انھوں نے اللہ کے کچھ کمزور بندوں کو غلام بنا رکھا تھا اور ان سے ان کو ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر شمال کی طرف سے بہت سے حملے ہوئے اور سارے حملوں میں ہندوستانیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہاں کے راجاؤں کو پبلک کی ہمدردی حاصل نہ تھی۔ یہی نہیں یہاں کے راجاؤں کے اندر آپس میں ہمدردی نہ تھی۔ سب سے بڑا روگ جو یہاں کا تھا اور اب تک ہے، وہ یہ تھا اور یہی ہے کہ یہاں کچھ لوگوں نے بہت سے لوگوں کو شودر (ناپاک) سمجھ رکھا تھا

اور اب بھی سمجھ رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وجہ ہے جس کے کارن ہندوستانیوں کو کبھی سکھ نہیں ملا۔ اور اس وقت تک نہ ملے گا جب تک ان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

یہ مضمون دیکھ کر چچا میاں نے کہا "ہاں، تم مضمون لکھ سکتے ہو۔ اس مضمون میں میں زیادہ غلطیاں نہیں نکالوں گا۔ ہاں آج صرف ایک بات یاد رکھو کہ جب حدیث کا حوالہ دو تو حرف بحرف حدیث نقل کرو چاہے ترجمہ ہی ہو۔

اس کے بعد میں نے مضمون لکھنے کی مشق شروع کر دی اور خدا کا فضل وکرم ہے کہ اب میں حلقۂ ادبِ اسلامی کا ممبر بنا لیا گیا ہوں اور اپنے قلم کو اس خدا کی مرضی کے مطابق حرکت میں لاتا ہوں جس نے مضمون لکھنے کی صلاحیت مجھے دی۔